ZAUQ-E-TAHQEEQ
www.Zauq-e-Tahqeeq.com
etitor@zauq-e-tahqeeq.com
ISSN PRINT: 2789-8776
ISSN ONLINE:2789-8784
Volume.3,Issue No.4(2021)
(July to September)

غزل ہے جس کا نام: فکری آئینے میں

That bears the name an Ode: In reflective perspective

ڈاکٹر عبدالستار نیازی
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اُردو، یونیورسٹی آف سیال کوٹ، سیال کوٹ
ڈاکٹر ارشد محمود ملک
لیکچرار، شعبہ اُردو، یونیورسٹی آف لاہور، سرگودھا کیمپس

Abstract:

The word ghazal (an ode) is occurred from the Arabic language that literally means to talk with the beloved. This sort of poetry has been originated after isolating form Iranian laudatory poem. According to exalted narration, Adam was the first poet and Hakism Sanaie, the first ode teller. Critics call this piece of poetry, a secret sentimental representation with the beloved. Rhyme is an integral part of the poem. The elements of mysticism to the ode to create holy poetry. Urdu ode developed from Quli Qutb Shah to Mir Taqi Mir via Arzu, Shah Hatim and Soda Mir called literally giant of this piece of poetry. Ghalib gave it a new dimension Iqbal did much more to uplift it. It is the most popular sort of poetry today. It is like the bride whose beauty will sustain forever. Imagination is the water of survival for the ghazal. For the poet, the real impetus for art is the desire for the possible existence of the non-existent. A good ghazal always grows in the shadow of high imagination, while sincerity acts as a perfume in the ghazal. The only thing that raised Mir Taqi Mir to the status of God's word was sincerity. Iqbal has interpreted it as blood and liver. In order to expand the scope of ghazal, Iranian poets also included the element of mysticism in it.

Keywords: Arabic language, isolating, laudatory poem, representation, holy poetry, Imagination, existence, Mir Taqi Mir, mysticism

غزل عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معانی سوت کاتنے (۱) یا بننے کے ہیں (۲) چرخے سے سوت کاتتے ہوئے جو پر سوز آواز نکلتی ہے اس غزل کہتے ہیں۔ یہ لفظ حسن و عشق کی باتوں، رنگین گیتوں اور محبت پر مشتمل کہانیوں کے لئے استعمال ہوتا تھا۔ بائیبل کی کتاب Songs of (songs) جو غنائی مکالموں پر مشتمل ہے، اس کا ترجمہ غزل الغزلات کے نام سے کیا گیا ہے[i]۔ شمس رازی نے اپنی کتاب المعجم میں انتقاد شعر کے بارے میں غزل کے مفہوم کو سمجھانے کے لیے آہو اور کتوں پر مشتمل تمثیل کے ذریعے خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔ ان کے بقول

"آہو جب شکاری کتوں کو دیکھتا ہے، پہلے تو بچ نکلنے کی کوشش کرتا ہے مگر جب بھاگتے بھاگتے عاجز آجاتا ہے اور تھک کر رہ جاتا ہے تو عالم بے وبسی و مجبوری میں اس کی زباں سے جو بے ساختہ چیخ نکلتی ہے۔ اس

میں اتنا درد ہوتا ہے کہ شکاری کتوں کے دل میں بھی ایسی رقت پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ اپنے شکار کو بھول کر
اس چیخ کے اثر میں کھو جاتے ہیں کہ انھیں اپنا مقصد بھول جاتا ہے۔"[ii]

غزل ایک وسیع المعانی الفاظ ہے۔ عربی میں غزل کے معانی لھو مع النسا[iii] ہے فارسی لغت کے مطابق باز بان گفتن بعض کے نزدیک ذکر زنان وعشق بازی باایشان وشرح زیبائی معشوق وبیاں سوز وگداز وحدیث اشتیاق دل باخنگی[iv] بقول رفیع دین ہاشمی غزل وہ صنف شعر ہے جس میں حسن وعشق کی مختلف کیفیات کا بیان ہو اور اس میں درد وسوز نمایاں ہو۔[v] بعض نے مرغ کے ذبح ہوتے وقت اس کے حلق سے نکلنے والی دردناک چیخ کو، بعض نے محبوب کو کی گھنی زلفوں کو، بعض نے اندھیری رات کو، بعض نے گفتگو کردن بازنان بادربارہ زنان[vi] بعض نے چلمن کے پیچھے چھپے حسن کو غزل کہا ہے۔ مختار صدیقی کے نزدیک ہزار شیوہ[vii] فراق گورکھ پوری نے اسے انتہاؤں کا سلسلہ[viii] کسی نے داخلی زندگی کی ترجمانی، کسی نے دلی اور دل کی یکجائی کا حسین مرقع، کسی نے اسے جہاں معانی، کسی نے اسے خفیہ زباں(Code language) کسی نے اسے ریختہ اور عابد علی عابد نے عالم طلسمات[ix] کو غزل کہا ہے۔

برصغیر میں غزل کا تاریخی ارتقاء:

غزل کا آغاز وارتقاء ابتدا میں قصیدے کے عشقیہ اشعار سے ہوا جو قصیدے کے آغاز میں بطور تمہید دیئے جاتے تھے انھیں تشبیب یانسیب کہا جاتا تھا۔ تشبیب کے لغوی معانی تذکرہ شباب، صفات محبوب، رازونیاز کی باتیں، محبوب کی باتیں اور محبوب سے متاثر ہونے کا ذکر اسی ذیل میں آتا ہے۔ چنانچہ ذکر احوال ایام شباب کردن وصفت محبوب وآتش آفروختن[x] جبکہ نسیب میں عشق ومحبت کا سرسری بیان ہوتا تھا ۔ جبکہ تشبیب میں مضمون کی کوئی قید نہ تھی۔ اس میں حسن وعشق کی باتیں، اخلاق وعرفاں کے مسائل، زمانے کی شکائتیں، اپنی بے بسی اور خستہ حالی کا تذکرہ بھی ہوتا تھا۔

جب ایرانیوں نے قصیدے کی تشبیب یانسیب میں حسن وعشق کے مضامین باندھنے شروع کیے تو انھوں نے ایک الگ صنف سخن کے آثار دیکھے تو انھوں نے قصیدے کی بجائے الگ سے تشبیب یانسیب لکھی شروع کر دی ہے۔ چوتھی صدی ہجری میں قصیدہ گوء شعرا نے قصیدے کو عشقیہ انداز میں لکھا شروع کیا تو چند اشعار کے بعد اصل مقصد یعنی ممدوع کی تعریف کرنے لگے۔ چنانچہ قصیدے کا پہلا حصہ تغزل کہلانے لگا۔ ادارہ معارف اسلامیہ کے نزدیک رُودکی کے زمانے جب غزل کا نام آتا ہے تو اس سے قصیدے کی تشبیب ہی مراد لی جاتی تھی بقول طارق ہاشمی فارسی شعرا نے قصیدے کے درخت سے ایک قلم لگائی یوں غزل معرض وجود میں آئی۔ علاوہ ازیں غزل کی ہیت اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ قصیدے سے کٹ کر الگ ہوئی ہے[xi]۔ ڈاکٹر رفیق لاسلام کے نزدیک قصیدے کی تشبیب کو الگ کر کے ایک منفرد صنف سخن قرار دیا تو اس صنف کا نام غزل پڑ گیا۔[xii]

زمانہ قدیم میں غزل بحیثیت اصطلاح موسیقی بھی تھی ساسانی دور میں خسرّوپرویز کے درباری گائیک باربد نے کم وبیش 362 راگنیاں ایجاد کی، جس میں ایک راگنی کا نام غزل بھی تھا۔ شمس رازی اس ضمن میں رقمطراز ہیں موسیقی کے ارباب ہنر نے رباعی کے وزن پر ایک لحن تشکیل دے کر ایک لطیف پیرائیہ تالیف کیا جو فارسی مقطعات کے وزن کے اشعار پر تشکیل دیئے جانے والے کو غزل کہا جانے لگا۔[xiii]

بارہویں صدی عیسوی میں حکیم سنائی نے پہلی بار اپنے دیوان میں غزل کو بحیثیت صنف شاعری استعمال کیا۔ ان کے دیوان میں 437 غزلیں ہیں۔ تقی الدین کاشی نے اپنے تذکرے خلاصہ الاشعار و زبدۃ الافکار میں حکیم سنائی کو ہی پہلا غزل گو شاعر قرار دیتے ہیں۔۔ پروفیسر اے ۔جی آربری کے بقول 'پہلا شاعر جس نے خوب خوب غزلیں کہی حکیم سنائی ہی تھا۔[xiv] سنائی نے اپنی غزلوں میں شاعری کی روح تال کو موسیقی کی روح کو میل سے اس طرح ملایا، جو بھی سنتا وہ سر دھننے لگتا۔ چنانچہ شاعری سے تھوڑی سی شناسائی رکھے والا بھی زندگی کے جدلیاتی پہلوؤں کو جذبو ں کی آنچ سے اشعار میں پیش کرنے لگا جو انسان کے اندر باطن اور خارج میں پرورش پاتے ہیں۔ اس طرح سنائی کی کہی ہوئی غزل ہی شاعری کی مسلمہ صنف قرار پائی۔ ڈاکٹر زہرا خلزائی اس ضمن میں رقمطراز ہے۔ 'حقیقت میں سنائی کو بابائے غزل کا نام دینا چاہیے۔ ان کی غزلیات شاعری کا ایسا سرچشمہ حیات ہیں۔ جس ایران کے تمام شعراء سیراب ہوئے[xv] اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ بہت ہی مختصر لفظوں میں ڈھنگ کی بات کہنے کا نام غزل ہے اگرچہ یہ مشکل کام ہے پھر بھی شعرا کی مشق سخن جاری و ساری ہے۔

ایرانی شعرا جب ہندوستان آئے تو انھوں نے خوشی خوشی اس سرزمیں میں غزل کا پودا لگایا بقول مجنوں گورکھپوری ایران میں صفویو ں کا اقتدار قائم ہوا تو بہت سے شعرا دربار کی سرپرستی سے محروم ہو کر ہندوستان چلے آئے۔ جہاں تیموری بادشاہوں کی سخاوت عروج پر تھی۔ ان شعرا میں عرفی، نظیری کلیم ہمدانی اور صائب قابل ذکر تھے۔۔ ان شعراء کا کمال سخن بھی ہندوستان آیا۔ ان کی فارسی شاعری میں ان کا انداز سخن بھی سبک ہندی قرار پایا[xvi] اردو غزل اپنے دامن میں ہماری تہذیب کو سمیٹے ہوئے ہیں اس ابتدا ہی سے اپنی اہمیت برقرار رکھی ہوئی ہے۔ رشید صدیقی اس ضمن میں رقمطراز ہیں 'غزل کو میں اردو شاعری کی آبرو سمجھتا ہوں، ہماری تہذیب غزل میں غزل ہماری تہذیب میں ڈھلی ہوئی ہے[xvii]

غزل کا اسلوب:

ہندوستاں میں غزل گوئی کا آغاز ریختہ گوئی یعنی فارسی اور ہندی کے تال میل سے ہوا، ریختہ بنیادی طور پر موسیقی کی اصطلاح تھی۔ بقول حافظ محمود شیرانی 'اس اصطلاح میں موسیقی کا یہ مقصد قرار پایا جو فارسی خیال ہندوی کے مطابق ہو اور اس میں دونوں زبانوں کے سرود تال ایک راگ میں بندھے ہو۔ اس کو ریختہ کہتے ہیں۔ اردو کی ابتدائی شکل ریختہ ہی تھا۔[xviii] قدیم شعرا کے ہاں غزل کے لیے ریختہ کا لفظ مستعمل تھا ۔ خسرو کے عہد سے اکبر کے زمانے تک میر و غالب کے دور تک غزل کو ریختہ کہا جاتا تھا۔ غزل کے عشقیہ پس منظر میں اس کا اسلوب دوسری اصناف سے الگ ہے۔ غزل کے اسلوب میں عشق و محبت کی فضا چھائی ہو اور محبوب کے جسمانی اوصاف کا بیان حد سے بڑھا نہ ہو۔ غزل میں محبوب کا ادب اور اس کی ناموس کا خیال ہمیشہ پیش نظر رہے، اس میں عاشق کی خود بینی اور ذاتی حیثیت کا خیال کم ہو۔ جذبات و خیالات کی رکاکت اور انداز بیاں فحش نگاری نہ ہو اور اشارے کنائے میں بھی کوئی ایسی بات نہ کہی جائے جو محبوب کے شایان شان نہ ہو۔ تشبیہ و استعارے اور صنائع و بدائع حد سے بڑھے ہوئے نہ ہو۔ ان کے بے جا استعمال سے غزل کی غنائیت کے زخمی ہونے کا احتمال ہے اس میں تاثیر، سوز و گداز اور تغزل کا خاص خیال رکھا جائے، اس کی زبان نرم، شریں سلیس اور عام ہو، اس میں کھردرے اور بھاری بھرکم الفاظ حتی المقدور لفظوں سے

اجتناب کیا جائے۔ یہ ایسی صنف سخن ہے جس کے اسلوب میں وسعت اور تنوع کا امکان ہمیشہ رہتا ہے۔ غزل میں جذبات واحساسات کا بیاں اصولوں سے انوکھانہ ہو بلکہ اپنی رفعت کے باوجود مانوس ہو۔ غزل کا یہ اسلوب مفہوم کو مد نظر رکھ کر مرتب کیا گیا ہے

غزل قصیدے کی طرح ایک ہی بحر میں لکھی جاتی ہے بقول ڈاکٹر ظہیر صدیقی 'غزل میں عام طور پر سات یا نو شعر ہوتے ہیں پہلے شعر کے دوسرے مصرعے ہم قافیے ہوتے ہیں جسے مطلع کہتے ہیں، غزل میں ایک سے زیادہ مطلعے بھی ہو سکتے ہیں باقی اشعار کا مصرعہ ثانی قافیہ وار ہوتا ہے اور آخری شعر کو مقطع کہتے ہیں جس میں شاعر اپنا نام یا تخلص لاتا ہے۔[xix] غزل متحدہ الوزن، متحدہ القوافی اور مختلف الموضوع پر اشعار کا سلسلہ ہے اسی لیے اسے برنگ کی موتیوں کی مالا کہتے ہیں۔ اچھی غزل ایک مرکزی موڈ کی حامل ہوتی ہے جسے تغزل کا نام دیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر یوسف حسین کے نزدیک 'تغزل تجربہ، تخیل اور جذبے کے باہمی ملاپ سے نمو پاتا ہے۔ شاعری مجازی حسن کے جمالیاتی تجربے سے گزر کر اور تخیل کی تحریک پاکر اس کے رگ وپے میں انتشار پیدا کر دیتا ہے، یہ تینوں چیزیں شاعرانہ صورت میں ڈھل کر تغزل بن جاتا ہے۔[xx] نیاز فتحپوری کے بقول 'تغزل کا تعلق صرف محبت سے ہے جو گوشت پوست کی دنیا میں گوشت پوست سے پیدا ہوتے ہیں اور جن کے پورا ہونے کی تمنا ہر محبت کرنے والے کو ہوتی ہے۔[xxi] غزل کی طرح تغزل کا لفظ بھی ہمارے ہاں اہل فارس کی طرف سے آیا ہے۔ یہ لفظ کلام میں موجودہ حسن ترتیب، خوبصورت انداز اور منفرد اسلوب کے لیے استعمال ہوتا ہے جو بے ساختہ قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے چونکہ غزل کا ہر شعر اکائی ہوتا ہے بعض نے تغزل کو آسمانی بجلی کے کوندے کی مانند قرار دیا ہے بقول شیخ صلاح الدین

> ہم ایک پہاڑ پر چڑھ رہے ہوں وہاں ہر طرف گھٹاٹوپ اندھیرا اور گھنگور گھٹائیں ہوں، جہاں بجلی بار بار کوندتی ہو، بجلی کے ہر کوندے پر وادی کا ایک منظر روشن ہو جاتا ہو، پھر اندھیرے میں گم ہو جاتا ہو اس قسم کے مناظر سے تسلسل ذہن اور تخیل جو کیفیت پیدا کرے گا۔ اس ایک جہاں تخلیق کر لینا بعید از قیاس نہ ہو گا۔ کھرے شاعر کی غزل کا ہر شعر ایسا ہی کوندا اور پوری غزل ایک جہانِ معانی ہوتی ہے۔[xxii]

غزل شاعر کی دُروں بینی کا نتیجہ ہے۔ اس صنف میں شاعر کائنات سے زیادہ دل کے قریب ہوتا ہے وہ خارجی تجربے کا اظہار فوری نہیں کرتا بلکہ شدت جذبات میں استقامت کا مظاہرہ کرتا ہے اس لیے غزل روزانہ کا روزنامچہ نہیں بلکہ یہ امروز فردا کی داستاں ہے۔ اس میں وقت کی رفتار صبح وشام کا تغیر سے نہیں بلکہ قرنوں اور صدیوں سے ناپی جاتی ہے۔

غزل کی فکری تشکیل:

عربی شعرا سے ایرانی شعرا تک سب نے ہی غزل میں اپنی قابلیت کے جوہر دکھائے۔ انھوں نے اس میں ابتدا ہی سے عشقیہ جذبات کا احاطہ کیا ہے۔ بعد ازاں اس میں وسعت ہوتی چلی گئی آج غزل میں عشق مجازی، عشق حقیقی، مسائل تصوف، محبت، فکر وفلسفہ، دین واخلاق، مسائل علم وعرفان، سیاست، باطن کی گہرائیاں، شراب اور اس کے لوازمات،، سرمستی، رندی، محبوب کے اعضائے جسمانی ان کی ہیت اور حالت، ان کی تعریف وتوصیف، فراق وجدائی، وصال سے لذت وصال تک اور حیات وکائنات کا ہر پہلو آسانی سے اس کی دسترس میں آچکا ہے۔

غزل کی بنیادی خصوصیت رمز و ایمائیت ہے بقول طارق ہاشمی "غزل گو شاعر علامت، استعارے اور کنایئے کے پردے میں بات کرتا ہے وہ سادہ لفظوں میں ایک جہان معانی سمو دیتا ہے جمال احسانی نے ایمائیت کو ایک شعر میں سمویا ہے۔

جمال کھیل نہیں ہے کوئی غزل کہنا

کہ ایک بات بتانی ہے اک چھپانی ہے[xxiii]

غزل داخلی شاعری کی عمدہ مثال ہے ڈاکٹر خواجہ ذکریا کے نزدیک "شاعر دل کے آئینے میں جھانک کر اس واردات قلبی کا اظہار کرتا ہے چنانچہ وارادت قلبی کے اظہار کا نام غزل ہے۔[xxiv] شاعر بھی تمام انسانوں کی طرح دو دنیاؤں میں سفر کرتا ہے ایک خارجی دنیا جو اس کے ارد گرد پھیلی ہوئی ہے اور دوسری داخلی دنیا جو اس کے باطن کی کیفیات، جذبات اور احساسات سے جڑی ہوئی ہے۔ اسے اپنی باطنی زندگی میں جو کچھ پیش آتا ہے اسے شعر کے پردے میں بیان کرنے کو داخلیت کہتے ہیں بقول داغ دہلوی:

حال دل تجھ سے دل آزار کہوں یا نہ کہوں

خوف ہے مانع اظہار کہوں یا نہ کہوں

غزل کی دوسری بنیادی خصوصیت اختصار پسندی ہے اس لیے کہ غزل کا ہر شعر بلکہ اس کا ہر مصرعہ چند لفظوں پر مشتمل ہوتا ہے اور شاعر نے ان قلیل لفظوں میں اپنا مفہوم بیان کرنا ہوتا ہے۔ بقول مجنوں گورکھ پوری "ایران کا مزاج اختصار پسند واقع ہوا ہے اور پرانی مذہبی کتابوں میں رمز و ایمائیت اور کنایہ ایجاز کا میلان غالب رہا ہے۔ اہل ایران نظم و نثر دونوں میں مختصر اور بلیغ ملفوظات کو زیادہ پسند کرتے تھے[xxv] شاعر دل کی وسعتوں کا اظہار دو مصرعوں میں گویا دو فولادی لائنوں میں رہتے ہوئے قارئین کو عالم بالا کی سیر کراتا ہے۔ شعری سطح پر جامع اور عجوبہ روزگار کے اظہار کی استعداد صرف غزل کے شعر میں ہے یہ مجاز مرسل کی ہی ایک قسم ہے جس میں کل کہہ کر جز اور جز کہہ کر کل مراد لیا جاتا ہے غزل میں بہت کچھ کہہ کر محدود اور لامحدود کے معانی لیے جاتے ہیں۔

تخیل غزل کے لیے آب بقا ہے شاعر کے لیے فن کاری کا اصل محرک ناموجود سے ممکن الوجود کی تمنا ہے۔ حال پر قناعت نہ کرنا اور ایک بہتر مستقبل کے حصول کی آرزو میں لگے رہنے کا تخیل کا نام دیا گیا ہے۔ اچھی غزل ہمیشہ اعلیٰ تخیل کے سایے میں پروان چڑھتی ہے۔ جبکہ خلوص غزل میں عطر کا کام کرتا ہے۔ خلوص سے غزل میں نشتریت پیدا ہو کر اس کے کلام کو معجزے میں تبدیل کر دیتی ہے۔ میر تقی میر کو خدائے سخن کے مرتبے پر فائز کرنے والی یہی چیز خلوص ہی تھا۔ اقبال نے اسے خون جگر سے تعبیر کیا ہے۔ ایرانی شعرا نے غزل کا دامن وسیع کرنے کے لیے اس میں تسوف کے عنصر کو بھی داخل کر دیا بقول امجد علی شاکر "صوفی بزرگ بھی غزل کہتے تھے جنھیں ایک سے زیادی عالم کا تجربہ تھا۔ یہ بزرگ غزل کہتے ہوئے مروج زبان سے لفظ تو لیتے مگر زماں و مکان کے موجود (Parameters) ترک کر دیتے۔ یوں غزل کے الفاظ (Physics) کی دنیا سے رہائی پا لیتے اور میٹافزکس کی دنیا میں داخل ہو جاتے۔[xxvi]

غزل میں صوفیانہ شاعری کے توسط سے وحدت الوجود، وحد الشہود، عرفان نفس، مسئلہ جبر وقدر، لاہوت، فنا اللہ، نور مطلق، بیم ورجا، مشاہدہ وجدانی اور حقیقت ومجاز کی اصطلاحیں غزل کا حصہ بن کر امر ہو گئیں۔ ابتدا میں قلی قطب شاہ، حسن شوقی، شاہی اور نصرتی نے عورتوں کی رنگین باتوں تک غزل کو محدود رکھا تھا۔ ولی کی غزلوں میں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اخلاق وحکمت، تصوف، پند ونصائح، راہ سلوک عشق ومحبت کے صنائع وبدائع اور تلمیحات شریں وفرہاد، خسرو وفرہاد، لیلیٰ ومجنوں، یوسف وزلیخا بھی دھیرے دھیرے اردو غزل کا حصہ بن گئیں۔ شمالی ہند میں ولی کی آمد سے یہاں کے شعرا میں غزل گوئی کی تحریک شروع ہوئی چنانچہ آرزو، آبرو، شاہ حاتم، مرزا مظہر جاناں، عبدالحی تاباں، اور مضمون نے ایہام گوئی کی تھریک کو رواج دیا۔ تاہم شاہ حاتم نے ایہام گوئی کو ختم کر کے اردو غزل کو سادگی کی راہ پر ڈال دیا۔ اب یہ حنائی ہاتھوں سے ذوق وشوق سے لکھی جانے لگی۔ چنانچہ میر تقی میر کی آہ زاریوں اور سودا کی بذلہ سنجیوں نے اسے بام عروج پر پہنچادیا، جہاں سے اس کی واپسی ممکن نہیں تھیں۔

دہلی کے اُجڑنے پر اکثر شعرائے اردو نے لکھنو جاکر بزم سخن آراستہ کی، جسغزل مُن مزید وسعت آگئی اب اس مُن ہر طرح کے مضامیں سموئے جانے لگے۔ تاہم انشاء کی دربار سے وابستگی نے غزل کی سنجیدگی کو خاصا نقصان پہنچایا اور ان کی غیر سنجیدہ روایت سعادت یار رنگیں سے ہوتی ہوئی قلندر بخش جُرات تک پہنچی۔ جھنوں نے غزل میں جنسی پہلو کا اظہار کر کے اسے ہوس کارانہ عشق کی منزل تک پہنچایا پھر امام بخش نے غزل کو پہلوانی کی چیز بنادیا۔ جس بناء پر شعراء نے باہمی مقابلے میں مشکل ردیف وقوافی کو استعمال کر کے غزل کی روح کو نقصان پہنچایا۔ شعرائے اردو نے صنائع وبدائع استعمال کر کے ظاہری لفظوں کی آرائش میں دو غزلہ سہ غزلہ لکھنے شروع کیے ان کی دوراز کار تشبیہات اور استعارات کے بے جا استعمال نے غزل کو چستیاں بنادیا آتش نے اردو غزل مُن رندی وسرمستی کو داخل کر کے اسے پھر سے مزے کی چیز بنادیا۔ نظیر اکبر آبادی نے غزل میں اپنا خاص رنگ دیا۔ داغ نے جرات کی معاملہ بندی کو جنسی جذبات کا اظہار کا نام دے کر اس میں جذبات عشق کے رنگ کو اور زیادہ تیکھا کر دیا۔ غالب، ذوق اور مومن نے اردو کی ایسی شمعیں روشن کی۔

جن کی روشنی کبھی بھی ماند نہیں پڑ سکتی، انھوں نے اس فن کو مزید وسعت اور گہرائی بخشی پھر اسی روشنی اور وسعت میں علامہ اقبال کی غزل پروان چڑھتی ہے جس نے اس میداں کو ہمہ گیر فلسفہ سے متعارف کرایا جس بناء پر ان کی غزل میں طرز بیدل سے لے کر استاد زوق تک سارے ہی رنگ ملتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کی غزل میں مابعد طبعیات سے لے کر فلسفہ، تصوف، اخلاقیات، رندی وسرمستی، خودی اور رموز بے خودی کے سارے رنگ اپنی عجیب بہار دکھارہے ہیں۔ اقبال کے بتائے ہوئے راستے پر حسرت موہانی، اصغر گونڈوی، فانی بدایونی، جگر مراد آبادی، شاد عظیم آبادی، جوش ملیح آبادیاور فراق گورکھ پوری نے اردو غزل کو اس قابل بنادیا کہ وہ دور جدید کے تقاضوں کا ساتھ دے سکے۔ جبکہ احسان دانش، عبدالحمید عدم، محمد دین تاثیر، فیض احمد فیض، سیف الدین سیف اور احمد ندیم قاسمی نے روایت اور تجربہ میں رنگ بھر کر اسے مقبول ترین صنف اور ایسی دلہن بنادیا جس پر زوال اور بڑھاپے کے کوئی آثار نہیں۔

حوالہ جات

۳۔ کتاب مقدس: لاہور۔ بائیبل سوسائٹی، انارکلی۔ ۲۰۰۲ء ص: ۶۵۵

۴۔ شمس قیس رازی: المعجم فی شعار العجم، دانش گاہ تہران، سن ندارد، ص: ۲۴

۵۔ المنجد: لوئیس معلوف، سن ندارد ص: ۲۲۰

۶۔ ابو الاعجاز حفیظ صدیقی: کشاف تنقیدی اصطلاحات، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زباں، ۱۹۸۵ء، ص: ۳۵

۷۔ رفیع الدین ہاشمی: اصناف ادب، لاہور، سنگ میل ۱۹۹۱ء ص: ۱۳

۸۔ قواعد انشاء لاہور، قومی کتاب گھر، ۱۹۷۲ء ص: ۴۲۲

۹۔ مختار صدیقی: غزل اور شہزاد کی غزل، مشمولہ فنون، لاہور، جدید غزل نمبر ۱۹۶۹ء ص: ۳۲۸

۱۰۔ فراق گورکھ پوری: غزل کی ماہیت و ہیت، مشمولہ 'نگار' کراچی، ۱۹۷۳ء ص: ۱۶

۱۱۔ سید عابد علی عابد: اصول انتقاد ادبیات، لاہور، مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۶ء ص: ۳۳۷

۱۲۔ ادارہ، معارف اسلامیہ، لاہور، ۱۹۷۰ء ص: ۴۴۰

۱۳۔ طارق محمود ہاشمی، ڈاکٹر: 'غزل نئی تشکیل' اسلام آباد، نیشنل بک فاؤنڈیشن ۲۰۰۸ء ص: ۱۴

۱۴۔ رفیق الاسلام، ڈاکٹر، 'غزل اور تنقید غزل' ص: ۸۹

۱۵۔ شمس قیس رازی 'المعجم فی اشعار العجم' ص: ۱۲۰

۱۶۔ اے۔ جی آربری، پروفیسر: ترجمہ سید عابد علی عابد ص: ۳۱۶

۱۷۔ زہرا خانلری: غزل فارسی، ص: ۴

۱۸۔ ظہیر احمد صدیقی، ڈاکٹر، تنقید و تحقیق و ادبیات، لاہور، مجلس تحقیق و تالیف، فارسی، جی، سی، یونیورسٹی، سن، ندارد، ص: ۱۳۵

۱۹۔ یوسف حسین خاں: 'اردو غزل' لاہور، الوقار پبلی کیشنز ۲۰۰۱ء ص: ۱۳

۲۰۔ نیاز فتح پوری: 'انتقادیات' کراچی، کتاب گھر، ۱۹۸۰ء ص: ۸۲

۲۱۔ صلاح الدین شیخ، ناصر کاظمی ایک دھیان، لاہور، مکتبہ خیال، ۱۹۸۶ء ص: ۱۱۸

۲۲۔ مجنوں گورکھ پوری: 'ادب اور زندگی' کراچی، مکتبہ دانیال، ۱۹۴۹ء ص: ۱۵۰

۲۳۔ رشید احمد صدیقی: 'جدید غزل' کراچی، سندھ اکیڈمی، ۱۹۸۶ء ص: ۹

۲۴۔ حافظ محمود شیرانی: 'پنجاب میں اردو' لکھنو، 'اتر پردیش اردو اکیڈمی ۱۹۸۶ء ص: ۱۴

۲۵۔ طارق محمود ہاشمی، ڈاکٹر، 'اردو غزل نئی تشکیل' ص: ۲۷

۲۶۔ ابو الاعجاز حفیظ صدیقی: 'کشاف تنقیدی اصطلات' ص: ۴۷

۲۷۔ امجد علی شاکر: 'غزل کی مابعد الطبعیات مشمولہ الزبیر، سہ ماہی بہاول پور شمارہ، ۳۔ ۲، ۲۰۱۶ء ص: ۱۷۶

۲۸۔ مجنوں گورکھ پوری 'ادب اور زندگی' ص: ۳۲۱